لیکن زرتشت نے اس کی تمام پیش کشوں کو ٹھکرادیا۔ "نہیں، میں خدائے واحد و حکیم کی عبادت کا دین کبھی ترک نہیں کروں گا خواہ اس میں مجھے جان کی قربانی دینی پڑے"

لیکن سالہا سال تک اس کی تبلیغ کا کوئی اثر نہ ہوا۔ جہاں کہیں اس نے بتوں کی پوجا، دیوتاؤں کی پرستش، جادوگری اور نجوم کے خلاف آواز اٹھائی، اس کا مذاق اڑایا گیا، اس کی تضحیک کی گئی، ہر قسم کے ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا جب لوگ اس کا استقلال دیکھتے، جب جادوگروں کا طلسم اس پر اثر نہ کرتا، جب پروہت اور کاہنوں کے تمام ہتھیار اس پر کارگر نہ ہوتے تو لوگوں نے اسے کاہنِ اعظم یا جادوگر اعظم کا لقب دینا پسند کیا مگر اس کی پیغمبری، اس کی روحانی عظمت، اس کی اخلاقی برتری کے قائل نہ ہوسکے۔ ان کے لئے یہ تصوّر کرنا ممکن نہ تھا کہ ایک شخص جوان کے درمیان پیدا ہوا، وہیں پروان چڑھا، وہیں زندگی گزاری، جوان کی طرح کھاتا اور پیتا، چلتا اور پھرتا ہو — وہ کس طرح ایک اخلاقی پیغام کا حامل، خدائے برتر و دانا کا برگزیدہ رسول، ایک اعلیٰ و برتر زندگی کا نمائندہ ہوسکتا ہے؟ پھر جس نہج پر وہ زندگی گزار رہے تھے، ایک خالص خانہ بدوشوں کی زندگی، جس میں نہ کوئی نظام تھا اور نہ اخلاق، محض لوٹ مار، کشت وخون، ڈاکہ زنی اور صحرانوردی — آخر وہ اس طریقۂ زندگی کو جو قدیم سے ان کے آباؤ اجداد سے پشت ہا پشت سے چلی آرہی تھی، کیوں چھوڑ دیں؟ دوست دشمن، اپنے اور بیگانے، سبھی نے اس کی طرف سے منہ موڑ لیا اور اس کو ہر قسم کی اذیتیں دیں حتیٰ کہ اس کی ہمت جواب دے گئی، اس کا اطمینانِ قلب ختم ہوگیا اور وہ چیخ اٹھا۔ اس نے اسی خدائے بزرگ و برتر کی طرف توجہ کی۔ یسنای ۴۶: ۱-۲ میں زرتشت پکارتا ہے: "میں کس ملک میں جاؤں، کس طرف کا رُخ کروں؟ میرے اعزہ واقارب اور اُمراء نے میری بات سننا گوارا نہیں کی۔ نہ میرے لوگ میری طرف توجہ کرتے ہیں اور نہ ظالم حکمران۔ ایسی حالت میں اے اہورامزدا، میں تیری رضا کو کیسے پورا کروں؟ اے مزدا، میں جانتا ہوں کہ میری ناکامی کی کیا وجہ ہے! میرے پیروؤں کی کمی ہی اس کا باعث ہے۔ میں رنج وغم کی شدّت میں تجھ ہی میں پناہ ڈھونڈتا ہوں اور تیری ہی مدد کا طالب ہوں۔ ایک مخلص دوست کی طرح میری مدد کر۔ نیکی کے راستے سے مجھے منش پاک کی فراوانی عطا فرما۔"

اس سے اس کے دل کو تسکین نصیب ہوئی اور وہ پھر اپنے کام میں منہمک ہوگیا۔ کچھ عرصے کے بعد اس کا ایک رشتے کا بھائی اس پر ایمان لے آیا۔ لیکن اس کے بعد پھر وہی معاملہ ہوا۔ اس نے اس مسئلہ میں بہت غور وخوض کیا۔ اسے بقول زرتشت نامہ خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ وہ گشتاسپ بادشاہ کے دربار میں جائے اور اس کے سامنے حقیقت کا انکشاف کرے: "دنیا میں نور سے بہتر کوئی اچھائی نہیں اور تاریکی سے بدتر کوئی بدی نہیں۔ آدم اور بہشت کی تخلیق اسی نور سے ہوئی اور دوزخ کا وجود اس نور کے عدم کے مترادف ہے۔ ان دونوں دنیاؤں میں جہاں اور جس طرف تم دیکھو گے وہاں میں اور نور وتجلّی موجود پاؤ گے۔ گشتاسپ کے پاس جاؤ۔ اس کو میری کتاب سناؤ اور خالص دین کی طرف دعوت دو تاکہ

وہ نیکی، بھلائی اور نور کی طرف آسکے اور کوئی شخص مجھ پر ظلم و ناانصافی کا الزام نہ لگا سکے۔ میں خالص بھلائی و خیر ہوں اور دن رات اسی مقصد کے لئے کوشاں۔ جو کچھ میری طرف سے علم تمہیں حاصل ہوا ہے اس میں سے کوئی چیز چھپا کر نہ رکھو اور سب کا سب گشتاسپ اور موبدوں کے سامنے پیش کر دو تاکہ وہ اہرمن کا رستہ چھوڑ دیں"۔ اس کے بعد زرتشت نے بلخ کی طرف رخ کیا اور بڑی مشکلات کے بعد بادشاہ کے دارالسلطنت میں جا پہنچا۔ دینِ حق کے دشمنوں نے کوشش کی کہ اس علمبردارِ انسانیت کی آواز بادشاہ تک نہ پہنچ سکے۔ چنانچہ وہ کئی دنوں تک اسی تگ و دو میں رہا۔ آخر کار ایک دن گشتاسپ نے اسے دربار میں بلایا اور اس کے آنے کا مقصد پوچھا۔ زرتشت نے اسے اہورامزدا کی عبادت کی طرف دعوت دی اور کہا: "میں خدائے واحد و برتر کا بھیجا ہوا ہوں۔ وہ خدا جس کے حکم و اطاعت میں یہ زمین و آسمان سرجھکائے اپنا فرض ادا کئے جا رہے ہیں۔ وہی ہے جو اس کائنات کا اور میرا اور تیرا سبھی کا خالق و رب ہے۔ وہی ہے جس نے ان کو زندگی دینے کے بعد ان کی خوراک کا بھی انتظام کیا وہی ہے جو اپنے تمام بندوں اور اپنی تمام مخلوق پر عنایات و بخششوں کی مسلسل بارش کرتا ہے۔ یہ ملک جس پر تم حکومت کرتے ہو یہ اسی کا ہے اور اسی نے تمہیں سونپا ہے تاکہ تم اس پر امن و انصاف سے حکومت کرو۔ وہی ہے جس نے تم کو نیستی سے اپنے امر سے ہست کیا۔ اس لئے اسی کی فرمانبرداری تم پر واجب ہے"۔ بادشاہ اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا اور قریب تھا کہ وہ اس کے دین کو قبول کر کے اہورامزدا پر ایمان لے آتا۔ لیکن اس کے دربار کے پروہت، کاہن اور جادوگر اپنے آبائی دین اور اس کے پیدا کردہ منافعوں سے اتنی جلد دست بردار ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔ انہوں نے زرتشت کو مناظرہ بازی کی دعوت دی۔ چونکہ انہیں امید تھی کہ شاید بادشاہ کے سامنے وہ ان کے من گھڑت دینیاتی مسائل اور نظریاتی گورکھ دھندوں کا جواب نہ دے سکے۔ چنانچہ یہ مباحث تین دن تک جاری رہے۔ ایک طرف زرتشت کی سادہ تعلیم تھی جو ہر معقول انسان کے دل و دماغ میں اتر جانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ دوسری طرف وہی پیچ در پیچ اور الجھانے والے نظریات اور توہمات جو مسائلِ حیات کو سلجھانے کی بجائے انسان کو شکوک و شبہات کی تاریک وادیوں میں بھٹکائے جاتے ہیں۔ آخر کار زرتشت کو فتح نصیب ہوئی اور تمام درباری پروہت اور جادوگر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اب خفیہ سازشوں کا جال بچھایا۔ جس میں زرتشت کو پھنسا کر قید خانہ میں ڈلوا دیا گیا۔

لیکن بہت جلد چند ایسے واقعات رونما ہوئے جس سے گشتاسپ کے تمام درباری بادشاہ کو مطمئن کرنے سے عاجز آگئے۔ اور بادشاہ کا یہ حال تھا کہ اس نے غم و فکر میں کھانا پینا تک چھوڑ دیا۔ اس حالت میں قید خانہ کے مہتمم نے حاضر ہو کر بادشاہ سے درخواست کی کہ زرتشت کو رہا کر کے اس سے مدد مانگنی چاہیئے۔ شاید وہ یہ مصیبت ٹال سکے۔ اس طرح زرتشت

آزاد ہُوا اور بادشاہ کی مشکل حل کرنے میں کامیاب ہُوا۔ اس کے بعد اب اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ بادشاہ فوراً اہورامزدا پر ایمان لے آیا اور اس کے بعد اس کی ملکہ۔ اب دینِ زرتشت سلطنت کے سایہ میں پھلنا پھولنا شروع ہُوا۔ پچاس سال تک زرتشت نے اپنے توحیدی دین کی اشاعت اور تبلیغ کی اور وہ دور دراز تک پھیلتا گیا۔ آخر کار وہ اپنے ملک اور دین کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہُوا۔

زرتشت کے دین کی دو خصوصیات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بار بار زرتشت اپنے سننے والوں یا پڑھنے والوں کے ذہن کو مخاطب کرتا ہے۔ وہ انہیں زندگی کے مختلف مسائل اور کائنات کے مختلف مظاہر کا مطالعہ کرنے کے لئے عقل و ہوش کی دعوت دیتا ہے اور کسی جگہ بھی یہ مطالبہ نہیں ملتا کہ ان چیزوں کو اس لئے تسلیم کرنا چاہئے کہ وہ کسی دیوتا یا خدا کی سند پر کہہ رہا ہے۔ "اے عظیم قوم کے فرزندو، عقل و ہوش سے میری بات سنو اور میرا مشورہ قبول کرو۔" (یسنا ۳۰،۲) اس طرح اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ اپنے گوش ہوش سے اس بہترین دین کی طرف توجہ کرو، ہر آدمی اور عورت کو چاہئے کہ وہ اپنی بھلائی کی طرف تیز گامی سے سبقت کرے۔ اس حکیمانہ طرزِ انداز اور طریقۂ کار کا یہ نتیجہ تھا کہ اوستا کی مختلف کتابوں میں ہمیں کئی جگہ دوسرے بزرگانِ دین اور پیروانِ مذہب کی تعریف ملتی ہے۔ فروردین یشت میں ایک جگہ مذکور ہے: "ہم ان سب نیک اور پرہیزگار مرد اور عورتوں کی توصیف کرتے ہیں جو خواہ کسی ملک میں پیدا ہوئے، جو ماضی میں تھے یا اب موجود ہیں جو پیدا ہونگے، جو ایک دینِ حق کے پیرو ہیں۔" دوسری خصوصیّت تعددِ آلہہ اور شرک کے خلاف ایک اعلانِ جنگ ہے۔ زرتشت کسی حالت میں بھی خدائے واحد کی عبودیت کے معاملے میں کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس نے ایک ایسے دور میں توحید کا نعرہ بلند کیا جب اس کے چاروں طرف ہزاروں دیوتاؤں کی پوجا ہو رہی تھی۔ آسمان، چاند، سورج، ستارے، آگ، پانی، درخت وغیرہ سبھی خداؤں کی شکل اختیار کر چکے تھے اور اگر نہیں تھی تو صرف اس اہورامزدا کی عبودیت جس کے آگے سر جھکانا اور جس سے مدد مانگنا ایک گناہ عظیم اور ایک ان دیکھا رواج سمجھا جاتا تھا۔ زرتشت نے ان تمام بندگیوں سے انسان کو آزاد کر دیا اور ایک خدا کے بزرگ و حکیم کے حضور میں لاکر اس کے ذہن و قلب کو پستی سے اٹھا کر اخلاق کی معراج تک پہنچا دیا۔ یسنا کی بارہویں فصل (۱۲-۲) میں جو توحید کا اقرار ہر زرتشتی سے کرایا جاتا تھا درج ہے: "میں اس دین میں اس لئے شامل ہُوا ہوں تاکہ دیوؤں (یعنی باطل معبودوں) کی عبودیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دوں۔ میں زرتشت کی تعلیم کے مطابق مزدا (عالم کل) پر ایمان کا اقرار کرتا ہوں۔ میں اہورا کی نازل کردہ شریعت کا پیرو ہوں۔ یہ تمام کائنات اسی حکیم، علیم، بصیر و دانا اہورامزدا کی تخلیق ہے میں تمام باطل خداؤں، شر اور بدی کے مجسموں، ابلیس اور اس کے شیطانی گروہ سے پناہ مانگتا ہوں، میں جادو اور دیگر ہر قسم کے کالے علم کو مردود قرار دیتا ہوں۔ میں اپنے خیالات، الفاظ اور اعمال سے باطل خداؤں اور ان کے ماننے والوں کی طاقت کو رد کرتا ہوں۔ اسی طرح اہورامزدا نے زرتشت کو تعلیم دی اور اسی چیز کا زرتشت نے اہورامزدا سے وعدہ کیا کہ وہ تعددِ آلہہ، شرک اور باطل خداؤں سے پناہ میں رہیگا۔ خود

قرآن کی ایک آیت میں مجوسیوں کے ذکر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ توحید پرستی کے قائل تھے :

ان الذین امنوا والذین هادوا والصابئین والنصارٰی والمجوس والذین اشرکوا ان اللہ یفصل بینهم یوم القیامة ان اللہ علی کل شئ شهید۔ وہ لوگ جو ایمان لائے یہودی، صابی، عیسائی اور مجوس، اور وہ لوگ جنہوں نے شرک کیا۔ خدا ان سب کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا۔ خدا ہر چیز پر گواہ ہے۔

زردشت کے دین کے متعلق دو عظیم الشان غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ ایک آتش پرستی اور دوسری عقیدہ ثنویت۔ ان غلطیوں کی نسبت کے کچھ وجود ضرور تھے لیکن یہ سارا معاملہ کم علمی اور خود مجوسیوں میں بعض الحاقی چیزوں سے پیدا ہوئیں۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے زرتشت نے خدائے واحد کی عبودیت کا اعلان کیا۔ اہورا کا لفظ زمانہ قدیم سے آریاؤں میں خدا کے لئے استعمال ہوتا تھا چنانچہ رگ وید وں میں اس کے لئے لفظ اسورہ پایا جاتا ہے۔ اسی طرح مزدا کا لفظ بھی مستعمل تھا جس کی موجودہ شکل فارسی میں ایزد آج بھی مروج ہے۔ زرتشت نے ان دونوں لفظوں کو ملا کر واحد خدا کے لئے نام تجویز کیا۔ اہورا مزدا کے معنی ہوئے حکیم و دانا، خالق و رب کائنات اہورا مزدا کا اطلاق بعض دفعہ کائنات کی قوتوں کے لئے بھی ہوتا ہے لیکن یہاں وحدت وجودی تصور سے کوئی مشابہت نہیں۔ اہورا مزدا کائنات میں جاری و ساری ہونے کے باوجود اس سے ماوراء ہے۔ وہ خالق اعلیٰ، عین قوت و دانش ہے۔ وہ سرچشمۂ خیر ہے، تمام تقوے اور نیکی کا منبع۔ اوستا میں لفظ اشا (یا ارتہ) آتا ہے جس کے معنی خیر اور تقوے (اخلاقی و مذہبی دونوں معنوں میں) دین حق و سعادت کامل کے ہیں۔ اسی لفظ اشا سے اشاون بھی مستعمل ہے جس کے معنی مومن کامل، متدین اور متقی کے ہیں۔ چنانچہ وندیداد فرگرد ابتدا اوّل میں اہورا کے اوصاف یوں درج ہیں "خدائے دانا، مینوئے پاک تر، آفریدگار جہان مادی، مقدس، بعض جگہ " اشا مزدہ اہورا " بھی استعمال ہوا ہے یعنی وہ خدائے بزرگ و برتر جو شریعت پاک اور تقوے کا منبع اعلیٰ ہے۔ گاتھا میں ایک جگہ خدا کے متعلق زرتشت کہتا ہے " اے مزدا، جب میں نے پہلے پہل تمہارا تصور کیا تو میرے نزدیک تو اس کائنات کا اولین خالق تھا، منش پاک (نیک تصور) کا باپ، اشا (خیر و تقوے کی شریعت) کا بانی، تمام انسانوں کے اعمال کا محاسب۔ وہ زمان اور مکان کی قیود سے بالا، ازلی و ابدی، ہمیشہ سے موجود، تمام کائنات کا رب و مولا۔

"اے اہورا، میں تجھ سے سوال کرتا ہوں، مجھے ٹھیک ٹھیک آگاہ کر کیا وہ چیز جس کا میں اعلان کرنے والا ہوں بالکل سچ ہے؟ کیا اشا (نیکی) اور اس کے بتائے ہوئے کام انسان کی آخر کار نجات کا باعث ہونگے؟ تم نے یہ زمین کس کے لئے خوشیوں کا مرکز بنائی؟

"اے اہورا میں تجھ سے سوال کرتا ہوں، مجھے ٹھیک ٹھیک آگاہ کر۔ کیا میں دروج (دروغ یعنی بدی کی روح) کو اشا کے سپرد کر کے، تمہاری محبت کے باعث ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر سکتا ہوں۔

"اب میں صاف صاف اعلان کرتا ہوں کہ جو شخص ہدایت کا طالب ہے اس کو چاہیئے کہ غور سے سنے اور توجہ

دے۔ اب اہورامزدا کا تصور کرو کیونکہ وہ ظاہر ہو چکا ہے۔ اس کے بعد اہرمین میں اب قوت نہیں کہ لوگوں کو گمراہ کرے اور ان کو زندگی بخش راستوں سے اپنے فریبوں سے روک سکے۔"

دینکرت میں ایک جگہ مندرجہ ذیل الفاظ میں خدا کی تعریف کی گئی ہے۔ "وہ بادشاہ ہے اور رعایا نہیں، وہ باپ ہے لیکن اس کی کوئی اولاد نہیں، وہ سردار ہے اور اس کا کوئی سردار نہیں، وہ غنی ہے اور فقر اس کے پاس نہیں پھٹکتا، وہ خود اپنی ذات میں علیم ہے کسی ذریعہ سے علم حاصل نہیں کیا، وہ ہدایت کرتا ہے، بخشش اور رحمت کرتا ہے۔"

گاتھا میں خدائے بزرگ و برتر کی چھ مختلف صفات کو مجموعی طور پر امشہ شپنتہ یا امشاسپندان کہا گیا ہے۔ چھ صفات یہ ہیں:

(۱) وہومن (نفس پاک)۔ (۲) اشاوہشتہ (قانون تقویٰ)۔ (۳) خشترہ وائیریہ (قدرت کامل)۔ (۴) ارمیتی (عقل پاک)۔ (۵) ہورو تات (کمال)۔ (۶) امرتات (ابدیت)۔

گاتھا کے بیان کے مطابق ان میں سے ہر ایک اہورامزدا کی کسی ایک صفت کا مظہر ہے اور ان میں سے ہر ایک کے سپرد اس کائنات کے کسی حصّے کی پاسبانی اور حفاظت سپرد کی گئی ہے۔

لیکن بدقسمتی سے مرورِ زمانہ سے یہ چھ مظاہر اہورامزدا کے ساتھ خود قابلِ پرستش تصوّر کئے جانے لگے اور اس طرح وہ مشرکانہ تصورات جن کی بیخ کنی کے لئے زرتشت نے اتنی کوشش کی تھی اس کے دین میں پھر سے داخل ہو گئے۔

اسی طرح زرتشت کے نزدیک آگ خدائی نور کی بہترین مثال ہے۔ تاریخی طور پر تقریباً ہر مذہب میں خدا کو نور یا آگ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ حضرت موسیٰ کو خدا کی تجلّی کا مشاہدہ آگ ہی کے ذریعے ہوا اور قرآن میں خدا کے لئے بہترین مثال یہی آگ ہے:

اللّٰہ نور السمٰوات والارض

زرتشت نے اس آگ کو اپنی عبادت گاہوں میں بطور قبلہ استعمال کرنے کا حکم دیا تھا کیونکہ آگ یا نور خدا کی تجلّی کا بہترین مظہر ہے۔ آگ تمام تاریکیوں اور بدبوؤں کو زائل کرتی ہے اور اس طرح پاکی اور نیکی کا راستہ ہموار کرتی ہے۔ زرتشت کے مطابق عبادت کا حقدار صرف خدائے پاک و بزرگ ہی ہے۔ جس طرح مرورِ زمانہ سے چھ مظاہر صفات اہورامزدا بعد میں خود خدا بن گئے۔ اسی طرح آگ بھی مرکزِ ستائش و عبادت قرار پائی۔

لیکن زرتشت کا سب سے نمایاں مسئلہ نیکی اور بدی کا تصوّر ہے اور اسی تصور کی بنا پر اس کا دین اکثر دوسرے دینوں سے ایک بالکل علیحدہ انفرادیت کا حامل ہے۔ نیکی کے ساتھ ساتھ بدی، خیر کے ساتھ شر کا وجود تو سبھی مفکرین نے تسلیم کیا ہے۔ یہ خیر و شر کی کشمکش جس طرح خارجی کائنات میں موجود ہے، اسی طرح معاشرے میں اور

انسانی نفس کے اندر بھی اس کا وجود ویسے ہی خطرناک نتائج پیدا کرتا ہے۔ نیکی، خیر اور بھلائی انسان کا مطمح نظر ہے۔ لیکن بدی اور شر کی وجہ سے یہ مقصد حاصل کرنے میں بڑی مشکلات اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اور اسی کشمکش سے ساری اخلاقی زندگی اور اخلاقی اقدار وجود میں آتی ہیں۔ اگر خدائے بزرگ و برتر خیر کل اور منبع خیر ہے تو یہ شر کیسے وجود میں آیا؟ یہ محض فلسفیانہ مسئلہ نہیں بلکہ انسان کی ساری مذہبی اور اخلاقی زندگی، اس کی فلاح و بہبود، اس نجات کا دارومدار اس سوال کے صحیح حل پر منحصر ہے۔

اس کش مکش خیر و شر کو سمجھنے کے لئے ہر زمانے میں مفکرین نے کوشش کی ہے۔ اس کا شاید بہترین اظہار ناصر خسرو کے مندرجہ ذیل اشعار میں پایا جاتا ہے:

بارخدایا! اگر ز روئے خدائی — گوہر انساں ہمہ جمیل سرشتی
چہرۂ رومی و طلعتِ حبشی را — مایۂ خوبی چہ بود و علت زشتی؟
طلعت ہندو و روئے ترک چرا شد — ہمچو دل دوزخی و روئے بہشتی؟
از چہ سعید او فتاد و از چہ شقی شد — زاہد محرابی و کشیش کنشتی؟
چیست خلاف اندر آفرینش عالم — چوں ہمہ را دایہ و مشاطہ تو گشتی؟

یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں اس شر کا مصدر ابلیس کو قرار دیا گیا ہے جس نے خدا کے حکم کی تعمیل سے انکار کیا اور اس کے بعد سزا کے طور پر ہمیشہ کے لئے نیکی اور خیر کے منبع سے رد کر دیا گیا۔ ابلیس نے مردود ہونے کے بعد اپنا انتقام انسان کو گمراہ کرنے سے لینا شروع کیا۔ لیکن ابلیس کا تعلق خدا کی ذات سے کیا ہے؟ اگر خدا محض خیر ہے تو ابلیس جو شر کا باعث ہے کہاں سے وجود میں آ گیا؟ ان سوالات کو اگر آپ طول دیں تو خود بخود ایک قسم کی ثنویت ظاہر ہو گی جس میں ایک طرف خدا اور فرشتے ہیں اور دوسری ابلیس اور اس کا شیطانی لشکر۔ مگر یہ ثنویت محض عارضی ہے کیونکہ آخر کار ابلیس اپنی تمام قوت اور حشمت کے باوجود خدا کے دائرۂ اقتدار سے باہر نہیں جا سکتا اور اسی جگہ یہ ظاہری ثنویت بنیادی وحدت میں آ کر گم ہو جاتی ہے۔ عبدالکریم الجلّی نے انسان کامل کے باب الستّون فصل ۲ میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چونکہ نفسِ محمدیہ کو اپنی ذات سے پیدا کیا اور ذاتِ حق جامع ضدین ہے اس لئے دو ضدین اس سے منشعب ہوئیں۔ ملائکہ عالین تو بہ حیثیت جمال و نور و ہدایت اور ابلیس اور اس کے اتباع بہ حیثیت صفات جلال، ظلمت و ضلال کے نفس محمدی سے پیدا ہوئے۔ بالکل اسی طرح کا حل زرتشت کے ہاں ملتا ہے۔ اہورا مزدا کے دو مختلف مظاہر ہیں۔ ایک طرف سپنتہ مینیو یعنی خرد مقدس یا جسے ہم نیکی کی قوت کہہ سکتے ہیں اور دوسری انگرہ مینیو خرد خبیث یا بدی کی قوت۔ گاتھا میں جہاں کہیں انگرہ مینیو کا ذکر آتا ہے وہ اہورا مزدا کے مقابل نہیں بلکہ سپنتہ مینیو کے مقابل۔ چنانچہ یسنای ۴۵ قطعہ ۲ میں مذکور ہے:

"اب میں ان دو گوہروں (مظاہر) کے متعلق کہنا چاہتا ہوں جو آغاز زندگی سے موجود تھے۔ ان میں سے گوہر پاک (یعنی خرد مقدس) نے گوہر خبیث (انگرہ مینیو) سے کہا کہ ہمارے خیالات و نظریات، خرد و آرزو، گفتار و کردار، دل اور روح باہم یگانہ و یکساں نہیں۔"

اسی طرح اہورا مزدا کو اگرچہ بعد میں سپنتہ مینیو کے ساتھ ایک ہستی سمجھ لیا گیا مگر یسنای کے باب ۱۹ میں اہورا مزدا کہتا ہے "ان دونوں گوہروں میں سے گوہر نیک نے تمام پاکباز افراد سے کہا......" اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اہورا مزدا ان دونوں قوتوں سے علیحدہ اور ماوراء ہے۔ اسی طرح یسنای ۴۵، ۹ میں مذکور ہے کہ اہورا مزدا نے انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے خیر و شر، بھلائی اور برائی دونوں کو تخلیق کیا۔ ایک دوسری جگہ یسنای ۴۳ قطعہ ۱۲ میں زرتشت اہورا مزدا سے رحمت و بخشش کی طلب سپنتہ مینو اور اس کے دیگر مظاہر کے واسطے سے کرتا ہے۔ کہتا ہے۔
"اے اہورا مزدا! اپنے آپ کو مجھے دکھا، آرمئتی کے طفیل مجھے توانائی بخش، سپنتہ مینیو کے واسطے مجھے طاقت دے، اشا کے توسط سے مجھ کو نیک پاداش سے بہرہ مند کر، وہومنہ کی طفیل مجھے توانائی دے۔"

اس نیک و بد کی مسلسل آویزش سے انسان کی تمام زندگی کا نقشہ مرتب ہوتا ہے۔ انسان کا مقصدِ حیات کیا ہے؟ دنیا کے مختلف اخلاقی نظام اس مسئلے کو مختلف شکلوں میں پیش کرتے ہیں۔ پہلا نظام تو وہ ہے جو بدی اور شر کو درخور اعتنا نہیں سمجھتا۔ اس نظریئے کی رو سے انسانی زندگی کا مقصد خوشی اور راحت حاصل کرنا ہے اور اس کا بہترین نمائندہ اپیکیورس تھا۔ یہ خوشی اور راحت جسمانی ہو یا روحانی بہرحال اس کا اقتضا یہ ہے کہ ہر وہ چیز یا ذریعہ جس سے انسان زندگی کے غموں کو فراموش کر سکے اور زیادہ سے زیادہ لذت پا سکے اختیار کئے جانے کے قابل ہے۔ تمام مادیت پرست اور وہ جو اگرچہ کسی مذہب کے پیرو ہوں لیکن جن کی نظر محض مادی اور خارجی مفادات تک محدود ہو سبھی اسی نظریۂ حیات کے قائل ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی بس یہی چند روزہ زندگی ہے اس لئے سب سے بہترین استعمال جو اس کا کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ جتنا ہو سکے اس کی لذتوں سے بہرہ اندوز ہوا جائے ؎

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

لیکن ایسے فلسفۂ حیات پر جو ماضی و مستقبل سے بے پروا ہو کر صرف عیش امروز تک انسانی زندگی کو محدود کر دے کوئی صحت مند معاشرہ یا تمدن کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ راحت و خوشی کے دلدادہ انسان ہر حالت میں اس زندگی سے اکتا کر آخر کار خودکشی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسانی زندگی اور کائنات کی تخلیق میں کوئی معنویت نہیں ہوتی اور ہر طرف انہیں خلا ہی خلا نظر آتا ہے اور اس کا نتیجہ خالص قنوطیت میں تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔

دوسری قسم کا نظامِ اخلاق شر اور بدی کے وجود کو تسلیم تو کرتا ہے لیکن انسانوں کو مشورہ یہ دیتا ہے کہ اس سے فرار اختیار کیا جائے۔ تقریباً سبھی مذاہب میں روح اور بدن کی موجودہ یکجائی میں روح کو ایک اعلیٰ منصب اور

بدن کو نچلے درجہ کا منصب دیا جاتا ہے۔ یہیں اختلافات کے باوجود یہ تصور سب میں مشترک ہے کہ تخلیقی قوتوں کا سرچشمہ روح ہے اور جسم محض ان قوتوں کے اظہار کا ذریعہ۔ اس لئے جسمانی خواہشات پر قابو پانا اور ان کو اعلیٰ مقاصد کے تحت رکھنا ہر مذہب کی تعلیم کا جزو رہا ہے۔ لیکن بعض مذہبوں نے جسم اور مادہ کے متعلق ایک مبالغہ آمیز نقطۂ نگاہ اختیار کیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ جسم فطری طور پر بدی کا سرچشمہ ہے جو روح کی پاکیزگی کو آلودہ کر رہا ہے اس لئے ایسے ذرائع اختیار کئے جانے چاہئیں کہ یہ دشمنی ختم ہو جائے۔ جب تک انسان زندہ ہے یہ ممکن نہیں تاہم کوشش کرنی چاہئے کہ انسانی روح جتنی جلدی بھی اس قید خانے سے نجات حاصل کرسکے بہتر ہے۔ اسی نظریہ کو صوفیا کے اس قول میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ موتوا قبل ان تموتوا یعنی مرنے سے پہلے مر جاؤ۔ مادے اور جسم کی اس فطری بدی کا اظہار ہندوستان کے اکثر نظام ہائے فکر میں ملتا ہے جس کا بہترین مظہر بدھ مت ہے۔ سینٹ پال نے کہا تھا کہ گناہ کا بدلہ موت ہے لیکن بدھ مت اور ہندوستان کے اکثر فلسفیوں کا خیال ہے کہ گناہ کا بدلہ زندگی ہے۔ گناہ کرنے سے انسان کو موت نہیں آتی بلکہ ایک نہ ختم ہونے والے آواگون کے چکر میں مبتلا ہو کر بار بار اس دنیا میں پیدا ہوتا رہتا ہے۔ یہ چکر صرف اسی حالت میں ختم ہو سکتا ہے جب وہ نیکی کی زندگی بسر کرنا شروع کر دے اور اس نیکی کا نتیجہ موت ہوگا اور اس طرح وہ اس زندگی کی مصیبتوں سے نجات حاصل کرسکے گا۔

اس مکتب فکر کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ یہ دنیا دکھوں اور پریشانیوں کا گھر ہے اور یہ پریشانیاں انسان کی فطری خواہشات اور تمناؤں کا نتیجہ ہیں۔ ہم ہر وقت کسی ایک نہ ایک خواہش میں مبتلا رہتے ہیں۔ کبھی دولت کی خواہش، کبھی شہرت کی، کبھی کھانے کی، کبھی سیر و سیاحت کی، غرض ہماری زندگی کا کوئی لمحہ بھی اس جذبہ سے خالی نہیں اور اسی لئے ہم کو وہ سکون اور اطمینان کبھی نصیب نہیں ہو سکتا جس کی تمنا ہمارے نہاں خانۂ دل میں چھپی رہتی ہے۔ شوپن ہار اسی نظریہ کا حامی تھا۔ اس کے نزدیک بنیادی چیز ارادہ ہے جو ہر انسان کو ہر وقت تگ و دو میں مبتلا رکھتا ہے اور ایک ثانیہ کے لئے اس کو چین و سکون سے رہنے نہیں دیتا۔ ارادی قوت سے مختلف قسم کے اعمال سرزد ہوتے رہتے ہیں اور انہی اعمال کے تانے بانے سے ہماری آرزوئیں اور خواہشات پیدا ہوتی ہیں اور یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ انسان کی تمام مصیبتوں اور پریشانیوں کا موجب ہے۔ اسی طرح یونان میں کلبی مدرسۂ فکر نے اسی قسم کے خیالات پیش کئے۔ ان کے نزدیک انسانی خواہشات کی تسکین سے خوشی پیدا ہوتی ہے لیکن اگر کوئی خواہش پوری نہ ہو تو اس سے دکھ کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ خواہش کا تتبع گویا خارجی ماحول پر انحصار ہے اور خارجی ماحول پر قابو پانا یا اسے اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنا ایک ناممکن امر ہے اس لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی خواہشات پر قابو پائے۔ سقراط کا قول تھا کہ نیکی خوشی کا بہترین ذریعہ ہے لیکن کلبیوں کے نزدیک نیکی کا مفہوم صرف خواہشات سے مکمل آزادی ہے۔ اس کے برعکس سیرینیک (Cyrenaic) مکتب فکر کے مطابق خوشی کا دارومدار

خواہشات سے آزادی نہیں بلکہ خواہشات کی تکمیل پر ہے البتہ اُنہوں نے اس چیز پر زور دیا کہ ہر انسان کو چاہیئے کہ اعلٰی اور ادنٰی خواہشات میں تفریق اور تمیز کرے اور صرف پہلی قسم کی خواہشات کی تسکین کا خیال رکھے۔ لیکن عوام کے لئے اس طرح کی تمیز ناممکن تھی اور بلند رُتبہ انسان بھی اکثر دفعہ اس تمیز کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ چنانچہ ان کی تعلیم کا نتیجہ بھی وہی قنوطیت تھا کہ پیدا ہونے سے نہ پیدا ہونا بہتر ہے اور اگر بدقسمتی سے کوئی پیدا ہو جائے تو اس کے لئے بہتر ہے کہ وہ مرنے سے پہلے اپنے آپ کو ختم کر ڈالے۔

ایسے انسانوں کے لئے معاشرہ اور اس کے مختلف مطالبات بالکل بے معنی رہ جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی صرف انفرادی ہے جس میں ہر آدمی کے لئے صرف اپنی نجات کا سوال ہے۔ اگر معاشرہ میں خرابیاں موجود ہیں اور دوسرے بے شمار انسان ہر قسم کے مظالم اور مفاسد کا شکار ہو رہے ہیں تو ان کے لئے یہ سب لغویات ہیں۔ ایسے خارجی مسائل کی طرف توجہ دینا مقصدِ حیات کے خلاف ہوگا۔ معاشرتی اصلاح، خیر و بھلائی کے کام، عوام کی فلاح و بہبود، تعلیم و تعلم کی کوششیں سبھی نیکی کی نہیں بلکہ بدی اور الجھنوں کو بڑھانے والے اعمال ہیں۔ بہترین راستہ اگر ہے تو صرف ترکِ دنیا اور قطعِ علائق۔ دولت کمانے سے بہتر ہے کہ دوسروں سے مانگ کر پیٹ کے مطالبات کو پورا کیا جائے۔ شادی کر کے اپنے آپ کو دنیاوی معاملات میں اُلجھانے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ خالص تجرد کی زندگی بسر کی جائے، صاف ستھرے رہنے اور اچھے پاکیزہ کپڑے پہننے کی بجائے بدن کو گندا رکھنا اور پھٹے پُرانے کپڑوں سے گزارا کر لینا نفس پر قابو پانے کے لئے بہترین لائحہ عمل ہوگا۔

اس رہبانی نظریہ کے حاملین کی نگاہ میں مقصدِ زندگی یہ ہے کہ انسان ان تمام علائق اور پریشانیوں سے بالا ہو کر صرف خدا سے تعلق پیدا کرے اور اس مقصد کے لئے ہر قسم کی جسمانی ریاضتیں کی جائیں تاکہ صحیح علم اور صحیح طاقت حاصل ہو سکے۔ ان کے خیال میں عمل کی بجائے بے عملی یا صرف علمی کاوش کافی ہے اور جس شخص کو حقیقت کا مشاہدہ ہو جائے اس کی نجات یقینی ہے۔ دنیا کے مختلف حصّوں میں اس قسم کے انسانوں کی تعداد بے شمار ہے جنہوں نے مختلف زمانوں میں اس طریقہ پر عمل کر کے اپنے مقصد کو حاصل کیا۔ لیکن سوال یہ ہے کیا ان کی یہ تمام کوششیں انسانی معاشرے کے کسی کام آسکیں؟ کیا ان کے اس فعل سے بدی اور شر کی قوتوں میں کوئی کمی واقع ہو سکی؟ کیا ظلم و فساد، ناانصافی اور ناجائز استحصال کے خلاف کوئی کامیاب جہاد ظاہر ہوا؟ درحقیقت یہ طریقہ کار سوائے انفرادی نجات کے اور کوئی فائدہ دوسرے انسانوں کو مہیا نہ کر سکا اور اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس نقطۂ نگاہ کا مرکزی محور خود غرضی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جب چاروں طرف بدی کا چلن موجود ہو اور ایک شخص جو اپنے نفس کو بچانے کے لئے گوشۂ عافیت تلاش کرے تو اس سے زیادہ انسانیت کا دشمن کون ہو سکتا ہے۔

یہ اسی غلط تصوّر کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں بھی اس شخص کو زیادہ عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جو دنیاوی تعلقات کو ترک کر کے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ کُنجِ عزلت میں گزار دے اور تسبیح و سجادہ کے مشاغل میں منہمک رہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص عملی زندگی میں نیکی اور بھلائی کے کاموں میں مشغول ہو، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض کو پوری تندہی سے

ادا کرتا ہو لیکن اس کی زندگی میں داخلیت خالص موجود نہ ہو تو وہ تقوے کے معیار پر پورا نہیں اترتا، وہ لوگوں کی نگاہ میں "خدا رسیدہ" نہیں کہلا سکتا۔

قرآن کی نگاہ میں جو شخص ان تعلقات کو جس کی تحریم خود خدا نے قائم کی توڑتا ہے وہ فسق کا مجرم ہے:

وما یضل بہ الا الفاسقین، الذین ینقضون عھد اللہ من بعد میثاقہ ویقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل ویفسدون فی الارض اولئک ھم الخاسرون۔ (۲: ۲۷)

خدا گمراہی میں انہی کو مبتلا کرتا ہے جو فاسق ہیں، جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں، اللہ نے جسے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، حقیقت میں یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

اسلام کی نگاہ میں زندگی کا مقصد محض انفرادی پوجا پاٹ یا مراقبہ و مشاہدہ نہیں بلکہ جہاد فی سبیل اللہ ہے جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ انسان اس زندگی میں ہر ممکن طریقے سے معروف کو عام کرنے اور منکر کو مٹانے میں کوشش کرے، خیر کو ترقی دینے اور مستحکم کرنے اور شر کا استیصال کرنے میں ہاتھ بٹائے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جو انفرادی نیکی میں بڑھ چڑھ کر ہوں لیکن نیکی اور بدی کی اس جنگ و کش مکش میں سست اور بے پرواہ ہوں تو ان کے تمام اعمال ضائع سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ غزوۂ تبوک میں تین مسلمان اپنی سستی کے باعث شامل نہ ہو سکے۔ واپسی پر مسلمانوں نے ان کے ساتھ ۵۰ دن تک مکمل مقاطعہ جاری رکھا اور یہ صرف اس لئے کہ خیر و شر کی جنگ میں حصّہ نہ لینا گویا دین سے انحراف ہے۔ اسی طرح ایک دو جگہ اس خیال کا بھی اعادہ کیا گیا ہے کہ جنت صرف ان لوگوں کا حق ہے جو اس زندگی میں اس کش مکش خیر و شر میں پورے طور پر شامل ہوئے۔

ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یعلم اللہ الذین جاھدوا منکم ویعلم الصابرین۔ (۳: ۱۴۲)

کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں؛

ام حسبتم ان تترکوا ولما یعلم اللہ الذین جاھدوا منکم ولم یتخذوا من دون اللہ ولا رسولہ ولا المومنین ولیجۃ۔

کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم چھوڑ دئے جاؤ گے حالانکہ اللہ نے ابھی نہیں جانا کہ تم میں سے کون لوگ اس خیر و شر کی جنگ میں حصّہ لیتے ہیں، وہ لوگ ہیں جو خدا، رسول اور ان لوگوں کا ساتھ دیتے ہیں جو اس کش میں خیر کو قائم کرنے کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں۔

ایک حدیث

فرقہ بندی

طبرانی نے صغیر میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی زبانی حضور اکرمؐ کا ایک ارشادِ گرامی یوں روایت کیا ہے :

یا عائشہ! "ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً ھم اصحاب البدع والاھواء لیس لھم توبۃ انا منھم بریٔ وھم منی بُرَآء

اے عائشہ! جو لوگ دینی فرقے پیدا کرتے ہیں اور مختلف ٹولیوں میں بٹ جاتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو بدعتی ہیں اور اپنی خواہشوں کے بندے ہیں۔ ان کی توتوبہ بھی کچھ نہیں، میں ان سے اور وہ مجھ سے بری ہیں۔ (ریاض السنہ صفحہ ۳۳)

یہ حدیث بڑی بنیادی اہمیت کی حامل ہے اور روح قرآنی کے عین مطابق ہے بلکہ ایک قرآنی آیت ہی کی تفسیر ہے یعنی سورۂ انعام کی ایک آیت کی تفسیر میں یہ الفاظ فرمائے گئے ہیں اور احادیث کی کتاب التفسیر میں اس کا ذکر ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے چند اہم نکات کو پہلے سمجھنا ہوگا۔

قرآن پاک میں ہے :-

ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً لست منھم فی شی۔

جن لوگوں نے دینی تفریق کی اور گروہ گروہ ہو گئے ان سے اے رسول تمہارا کچھ واسطہ نہیں۔

دوسری جگہ ارشاد قرآنی ہے :

ولا تکونوا من المشرکین الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعًا۔

اے مسلمانو! تم ان مشرکوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے دینی تفریق پیدا کرلی اور گروہ گروہ ہو گئے۔

پہلی آیت میں دینی فرقے بندیاں پیدا کرکے گروہوں میں بٹ جانے والوں کو رسولؐ سے بے تعلق بتایا گیا ہے اور یہی مضمون ہے جسے زیر بحث حدیث میں یوں ادا فرمایا گیا ہے کہ : انا منھم بریٔ وھم منی براء۔ یعنی میں ان سے اور وہ مجھ سے بری و بے تعلق ہیں۔ ظاہر ہے کہ رسول سے بری ہونے کے بعد ایک دعویدارِ اسلام کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ دوسری آیت میں تو اس سے بھی زیادہ درشت انداز اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی دینی فرقے بندی پیدا کرکے گروہوں میں بٹ جانے والوں کو مشرکوں کی صف میں شمار کیا گیا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے۔ اس لئے کہ موحد وہ ہوتا ہے جو وحدتِ ربانی کا

قائل ہو اور اس وحدتِ ربانی کا لازمی عملی نتیجہ وحدتِ انسانی ہونا چاہئے۔ لہٰذا انسانوں کے ٹکڑے کرنے والے ایسے ہی ہیں جیسے خدائی کے ٹکڑے کرکے بہت سے چھوٹے بڑے خدا بنانے والے مشرک۔ دیکھئے زیرِ نظر حدیث میں بھی یہی بات فرمائی گئی ہے کہ: ھم اھل البدع والاھواء۔ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو بدعتی اور بندۂ ہوا ہیں۔ اپنی خواہشوں کے بندے بھی مشرک ہی ہوتے ہیں، جن کے متعلق قرآن پاک یوں فرماتا ہے کہ:

افرأیت من اتخذ الٰھہ ھواہ؟

کیا تم نے اسے بھی دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش کو اپنا الٰہ بنا رکھا ہے؟

مطلب یہ ہے کہ جس طرح احکام خداوندی کی اطاعت کے مقابلے میں دوسروں کی اطاعتِ حکم کرنے والا مشرک ہوتا ہے اسی طرح وہ بھی مشرک ہے جو حکمِ الٰہی کے مقابلے میں اپنی خواہشوں کی پیروی کرے۔ کیونکہ غیر اللہ میں صرف دوسرے ہی نہیں خود انسان کی اپنی ذات بھی ہے۔

اپنی خواہش کی بندگی سے پہلے "بدعت" کا ذکر ہے۔ (ھم اھل البدع والاھواء) بدعت یوں تو ہر اُس نئی چیز کو کہتے ہیں جو پہلے نہ ہو۔ لیکن ہر بدعت اور ہر نئی بات اس وعید میں داخل نہیں بعض لوگ ہر اس چیز اور ہر اس کام کو بدعت بتاتے ہیں جو حضور اکرمؐ کے زمانے میں نہ ہوئی ہو۔ لیکن اس غلط تعریف میں نہ فقط دُنیا کے تمام نئے ایجادات آجائیں گے۔ بلکہ بدعت کی یہ غلط تعریف کرنے والے بھی خود اسی تعریف کے لپیٹ میں آجائیں گے کیونکہ وہ خود بھی حضورؐ کے زمانے میں موجود نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین و فقہاء کو بدعت کی دو قسمیں کرنی پڑی ہیں۔ بدعتِ سیئہ اور بدعتِ حسنہ۔ اور بدعتِ حسنہ کو تو "سنت" بھی قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ امام عبدالغنی نابلسی لکھتے ہیں کہ:

ان البدعۃ الحسنۃ الموافقۃ لمقصود الشرع تسمی سنۃ

جو بدعتِ حسنہ مقصودِ شرع کے مطابق ہو اس کا نام بھی سنت ہی ہے

پس معلوم ہوا کہ ہر نیا کام اور ہر نئی چیز بدعت یعنی بدعتِ سیئہ نہیں۔ جس بدعت پر وعید آئی ہے وہ وہی بدعت ہے جو اپنی خواہشوں کی بندگی میں ہو اور دینی تفریق پیدا کرے۔ یہی بات ایک دوسری حدیث میں یوں فرمائی گئی ہے کہ:

من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو ردٌّ۔

جو شخص ہمارے اس امر (دین) میں ایسی نئی بات نکالے جو دراصل اس میں نہیں تو وہ مسترد کر دینے کے قابل ہے

غرض جب تک "دینی احداث" نہ ہو کوئی چیز بدعت نہیں ہو سکتی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ دینی تفریق، دینی فرقے بندیاں اور دینی گروہ بندیوں سے بڑھ کر کوئی دینی احداث نہیں ہو سکتا۔ پس اھل البدع ہوں یا اھل الاھواء دونوں ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں جو بالکل درست اور عین منشائے قرآنی کے مطابق ہیں۔

دینی تفرقے کا مطلب۔ اب ایک بڑا اہم اور قابلِ غور مسئلہ یہ سامنے آتا ہے کہ "دینی تفرقے" کا مطلب کیا ہے؟ کیا دینی وحدت کا مطلب ایک ایسی آمریتِ مطلقہ کا قیام ہے جس میں تمام آزادیِ رائے کو کچل دیا جائے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ آراء و خیالات کا فطری تنوع ختم کر دیا جائے؟ کیا ان ائمہ مجتہدین کو دینی تفرقے کا مرتکب قرار دیا جائے جنہوں نے ساری زندگی دینی مسائل کو حل کرنے میں صرف کرتے ہوئے مختلف مدارسِ خیال قائم کئے؟ کیا صحابہ کرام کی رائیں بہت سے دینی مسائل میں باہم مختلف نہ تھیں؟ کیا وہ تمام اساطین اسلام اور بزرگانِ کرام جنہوں نے اپنے آپ کو حنفی، شافعی، مالکی یا حنبلی کہا یا کسی اور مدرسۂ خیال سے منسوب کرتے رہے دینی تفرقے یا شرک کے مرتکب ہوتے رہے؟ — ہم کبھی بھی ان سوالات کا جواب اثبات میں دینے کی جسارت نہیں کر سکتے اور جو شخص ایسی جرأت کرے اسے پہلے اپنے ایمان و اسلام کی خبر لینی چاہئے۔

ہم جہاں تک غور کر سکے ہیں دینی تفرقے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کسی دینی گروہ سے چپکنے میں ایسی عصبیت جاہلیہ رکھے کہ بلا غور و فکر اس کی ہر بھلی بُری بات کی تائید کئے چلا جائے۔ اور دوسرے گروہ کی ہر بُری بھلی چیز کی اندھا دھند مخالفت و تردید کئے جائے۔ (من بعد ما جاء ھم البیّنٰت) اسی عصبیت کو قرآن "حمیۃ الجاھلیۃ" کہتا ہے۔ یہ حمیت جاہلیت وطنی، نسلی، لونی، لسانی اور پیشائی بنیاد پر جب مذموم ہے تو "مذہبی" بنیاد پر کیونکر قابلِ ستائش ہو سکتی ہے؟ یہ سب کی سب "قبیلوی عصبیتوں" کی قسمیں ہیں جس کی جڑیں نفسِ انسانی کی انتہائی گہرائیوں میں گڑی ہوتی ہیں اور قبیلوں کی نسلیں ختم ہونے کے بعد بھی نہیں نکلتیں۔ اسلام تمام قسم کی جاہلی عصبیتوں اور حمیتوں سے باہر لا کر انسان کو ایسے مقام پر کھڑا کرنا چاہتا ہے جہاں حمایت و مخالفت کا معیار ترک و اختیار کی کسوٹی اور ردّ و قبول کا مقیاس صرف نیکی و بدی ہو نیز لیھلک من ھلک عن بینۃ ویحییٰ من حیّ عن بینۃ۔ حیات و ہلاکت دونوں عقل و برہان اور دلیل و بینات کی بنیاد پر ہو۔ پس بینات سے صرفِ نظر کر کے محض گروہی عصبیت کی بنیاد پر کسی مدرسۂ خیال کی کلّی تائید کئے جانا فرقے بندی ہے اور یہ اسلام کی کسی جہت سے بھی قابلِ تعریف نہیں۔ وحدتِ انسانی تو ایک طرف رہی اس سے تو وحدتِ ملی اور وحدتِ قومی بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ کسی فرقے کے متعلق یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ وہ سر سے پاؤں تک صحیح ہے اور یہ ادعا بھی صحیح نہیں کہ وہ الف سے ی تک غلط ہے۔

وحدتِ انسانی تو اصل نصب العین ہے لیکن اس سے پہلے ایک ضروری قدم "وحدتِ ملی" اور پھر وحدتِ قومی ہے۔ وحدتِ ملی کے لئے "وحدتِ شریعت" بھی ویسی ہی ضروری ہے۔ یعنی ایک اسلامی مملکت محض دستورِ اسلامی کے خوش آیند الفاظ سے اسلامی مملکت نہیں بن جاتی۔ اگر اسے علیٰ منہاج نبوّت کوئی اسلامی مملکت بننا ہے تو اس کے لئے وحدتِ شریعت بھی لازمی ہے۔ یعنی پورے ملک کی شریعت یا قانون ایک ہو۔ ایک ملک میں دس شریعتیں یعنی دس قانون کسی عقلمند کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ قانون بہرحال ایک ہی ہوگا۔ جو ہر فرد پر، ہر اعلیٰ و ادنیٰ پر